U35Q18 . Date 30-12-03

Title – KHUTBA-E-SADARAT INDIAN NATIONA
CONGRESS.

Creator – Abul Kalaam Azad

Publisher – (Ramgarh).

Date – 1940

Pages – 40

Subjects – Azad, Abul Kalaam – Khutba-e-
Sadarat.

۷۵

خطبۂ صدارت

انڈین نیشنل کانگریس

ترپنواں اجلاس

رام گڑھ مارچ ۱۹۴۰

ابوالکلام آزاد
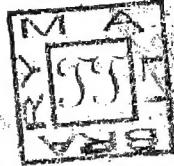
دوستو! ۱۹۲۳ء میں آپ نے مجھے اس قومی مجلس کا صدر چُنا تھا۔ اب سترہ برس کے بعد دوسری مرتبہ آپ نے یہ عزّت مجھے بخشی ہے۔ قوموں کی جدّوجہد کی تاریخ میں سترہ برس کی مدّت، کوئی بڑی مدّت نہیں ہے۔ لیکن دنیا نے اپنی تبدیلیوں کی چال اس قدر تیز کر دی ہے، کہ اب وقت کے پُرانے اندازے کام نہیں دے سکتے۔ اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں۔ ہمارا سفر دور کا تھا۔ اور ضروری تھا، کہ مختلف منزلوں سے گزرے۔ ہم ہر منزل میں ٹھہرے۔ مگر رُکے کہیں نہیں۔ ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا، مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں۔ ہمیں طرح طرح کے اُتار چڑھاؤ پیش آئے، مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے ہی کی طرف رہی۔ دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں، مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا۔ ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقتور رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے، نہ چل سکے ہوں، لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر ہم ۲۳ء اور ۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں، تو ہمیں اپنے پیچھے بہت

دور ایک دھندلا سا نشان دکھائی دے گا۔ سنہ ۲۳ میں ہم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی، کہ اُس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ لیکن آج نظر اُٹھائیے، اور سامنے کی طرف دیکھئے! نہ صرف منزل کا نشان صاف صاف دکھائی دے رہا ہے، بلکہ خود منزل بھی دور نہیں ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے، کہ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی ہے۔ ہماری جدوجہد کی آزمائشیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ آج واقعات کی تیز رفتاری نے جہاں ہمیں پچھلے نشانوں سے دور، اور آخری منزل سے نزدیک کر دیا ہے، وہاں طرح طرح کی نئی نئی اُلجھنیں اور مشکلیں بھی پیدا کر دی ہیں، اور ایک بہت ہی نازک مرحلے سے ہمارا کارواں گزر رہا ہے۔ ایسے مرحلوں کی سب سے بڑی آزمائش اُن کے متضاد امکانوں میں ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارا ایک صحیح قدم ہمیں منزل مقصود سے بالکل نزدیک کر دے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایک غلط قدم طرح طرح کی نئی مشکلوں میں اُلجھا دے۔ ایک ایسے نازک وقت میں آپ نے مجھے صدر چن کر اپنے جس بھروسے کا اظہار کیا ہے، وہ یقیناً بڑے سے بڑا بھروسا ہے، جو مُلک کی خدمت کی راہ میں آپ اپنے ایک ساتھی پر کر سکتے تھے۔ یہ بہت بڑی عزّت ہے، اس لئے بہت بڑی ذمّہ داری ہے۔ میں اس عزّت کے لئے شکر گزار ہوں، اور ذمّہ داری کے لئے آپ کی رفاقت کا سہارا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس گرمجوشی کے ساتھ آپ نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ ویسی ہی گرمجوشی کے ساتھ آپ کی رفاقتیں بھی میرا ساتھ دیتی رہیں گی۔

وقت کا اصلی سوال

اب میں سمجھتا ہوں، مجھے بغیر کسی تمہید کے وقت کے اصلی سوال پر آجانا چاہئے۔

ہمارے لئے وقت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم سوال یہ ہے۔ کہ ۳۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کے اعلان جنگ کے بعد ہم نے جو قدم اُٹھایا ہے۔ وہ کس طرف جا رہا ہے؟ اور اِس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟۔

غالباً کانگرس کی تاریخ میں اُس کے ذہنی نقشے کا یہ ایک نیا رنگ تھا، کہ ۱۹۳۶ء کے اجلاس لکھنؤ میں یورپ کی بین القومی (انٹرنیشنل) صورت حال پر ایک لمبی تجویز منظور کر کے اُس نے اپنے نقطۂ خیال کا صاف صاف اعلان کر دیا، اور اُس کے بعد سے وہ کانگرس کے سالانہ اعلانوں کا ایک اہم اور ضروری حصّہ بن گئی۔ یہ گویا اس بارے میں ہمارا ایک سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا جو ہم نے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

ان تجویزوں کے ذریعہ ہم نے دنیا کے سامنے ایک ہی وقت میں دو باتوں کا اعلان کیا تھا :۔

سب سے پہلی بات جسے میں نے ہندوستانی سیاست کے ایک نئے رنگ سے تعبیر کیا ہے ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم اپنی آج کل کی مجبوری کی حالت میں بھی دنیا کی سیاسی صورت حال سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے مستقبل کی راہ بناتے ہوئے، ہم صرف

اپنے چاروں طرف ہی نہ دیکھیں۔ بلکہ اس سے باہر کی دنیا پر بھی برابر نظر رکھیں۔ زمانے کی بے شمار تبدیلیوں نے ملکوں اور قوموں کو اس طرح ایک دوسرے سے نزدیک کر دیا ہے۔ اور فکر اور عمل کی لہریں ایک گوشے میں اُبھر کر اس تیزی کے ساتھ دوسرے گوشوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں، کہ آج کل کی حالت میں ممکن نہیں، ہندوستان اپنے مسئلوں کو صرف اپنی چار دیواری کے اندر ہی بند رہ کر سوچ سکے۔ یہ ناگزیر ہے، کہ باہر کے حالات، ہمارے حالات پر فوری اثر ڈالیں اور ناگزیر ہے کہ ہماری حالتوں اور فیصلوں سے دنیا کی حالتوں اور فیصلوں پر اثر پڑے۔ یہی احساس تھا، جس نے اس فیصلے کی شکل اختیار کی۔ ہم نے ان تجویزوں کے ذریعہ اعلان کیا کہ یورپ میں جمہوریت اور انفرادی اور قومی آزادی کے خلاف فیشسزم اور نالتسی ازم کی جو ارتجاعی (Reactionary) (ری ایکشنری) تحریکیں روز بروز طاقت پکڑتی جاتی ہیں، ہندوستان انھیں دنیا کی ترقی اور امن کے لئے ایک عالمگیر خطرہ تصوّر کرتا ہے۔ اور اُس کا دل اور دماغ اُن قوموں کے ساتھ ہے، جو جمہوریت اور آزادی کی حفاظت میں ان تحریکوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

لیکن جب فیشی ازم اور نالتسی ازم کے خطروں کے خلاف ہمارا دماغ جا رہا تھا۔ تو ہمارے لئے ناممکن تھا کہ ہم اُس پرانے خطرے کو بھلا دیتے۔ جو ان نئی قوتوں سے کہیں زیادہ قوموں کے امن اور آزادی کے لئے مہلک ثابت ہو چکا ہے، اور جس نے فی الحقیقت ان نئی ارتجاعی (Reactionary) تحریکوں

کی پیدائش کا سارا مواد بہم پہنچایا ہے۔ میرا اشارہ برطانیہ کی سامراجی قوت کی طرف ہے۔ اسے ہم ان نئی ارتجاعی (Reactionary) قوتوں کی طرح دور سے نہیں دیکھ رہے، یہ خود ہمارے گھر پر قبضہ جمائے ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ اس لئے ہم نے صاف صاف لفظوں میں یہ بات بھی کھول دی۔ کہ اگر یورپ کی اس نئی کشمکش نے لڑائی کی شکل اختیار کر لی تو ہندوستان جو اپنے آزاد ارادے اور آزاد پسند سے محروم کر دیا گیا ہے، اس میں کوئی حصہ نہیں لے گا۔ وہ صرف اسی حالت میں حصہ لے سکتا ہے، جب کہ اُسے اپنی آزاد مرضی اور پسند سے فیصلہ کرنے کی حیثیت حاصل ہو۔ وہ نازی ازم اور فیسشزم سے بیزار ہے۔ مگر اُس سے بھی زیادہ برطانوی شہنشاہیت سے بیزار ہے۔ اگر ہندوستان اپنی آزادی کے قدرتی حق سے محروم رہتا ہے، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں، کہ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام روایتی (Traditional) خصوصیتوں کے ساتھ زندہ موجود ہے۔ اور ہندوستان کسی حال میں تیار نہیں کہ برطانوی شہنشاہی کی فتحمندیوں کے لئے مدد دے۔

یہ دوسری بات تھی جس کا یہ تجویزیں لگاتار اعلان کرتی رہیں۔

یہ تجویزیں کانگریس کے اجلاس لکھنؤ سے لے کر اگست ۳۹ء تک منظور ہوتی رہیں۔ اور "لڑائی کی تجویزوں" کے نام سے مشہور ہیں۔

کانگریس کے یہ تمام اعلان برٹش گورنمنٹ کے سامنے تھے کہ

اچانک اگست ۱۹۳۹ء کے تیسرے ہفتے میں لڑائی کے بادل گرجنے لگے، اور ۳ ستمبر کو خود لڑائی بھی شروع ہو گئی۔

اب میں اس موقعہ پر ایک لمحہ کے لئے آپ کو آگے بڑھنے سے روکوں گا۔ اور درخواست کروں گا کہ ذرا پیچھے مڑکر دیکھئے پچھلے اگست کو آپ نے کن حالات میں چھوڑا ہے؟

برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہندوستان کے سر جبراً تھوپا، اور حسب معمول دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس نے ہندوستان کو اس کے قومی حق کی ایک بہت بڑی قسط دے دی ہے۔ کانگریس کا فیصلہ اس بارے میں دنیا کو معلوم ہے۔

تاہم اس نے کچھ عرصے کے لئے دم لینے کا ارادہ کیا، اور اس پر آمادہ ہو گئی کہ ایک خاص شرط کے ساتھ وزارتوں کا قبول کرنا منظور کرے۔ اب گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں اسکی وزارتیں کامیابی کے ساتھ کام کر رہی تھیں، اور یہ بات خود برطانوی حکومت کے حق میں تھی کہ اس حالت کو جس قدر زیادہ مدت تک قائم رکھا جا سکتا ہے، قائم رکھے۔ ساتھ ہی صورت حال کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ جہاں تک لڑائی کی ظاہری صورت کا تعلق ہے، ہندوستان صاف صاف لفظوں میں نازی جرمنی سے اپنی بے زاری کا اعلان کر چکا تھا۔ اُس کی ہمدردیاں جمہوریت پسند کرنے والی قوموں کے ساتھ تھیں، اور صورت حال کا یہ پہلو بھی برطانوی حکومت کے حق

میں تھا۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ اگر برطانوی حکومت کی پرانی سامراجی ذہنیت (Mentality) میں کچھ بھی تبدیلی ہوئی ہے تو کم از کم ڈپلومیسی (Diplomacy) ہی کی خاطر وہ اس کی ضرورت ضرور محسوس کرے گی۔ کہ اس موقعہ پر اپنا پرانا ڈھنگ بدل دے، اور ہندوستان کو ایسا محسوس کرنے کا موقع دے کہ اب وہ ایک بدلی ہوئی آب و ہوا میں سانس لے رہا ہے۔ لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ اس موقعہ پر برطانوی حکومت کا طرز عمل کیسا رہا؟ تبدیلی کی کوئی ذرا سی پرچھائیں بھی اس پر پڑتی ہوئی دکھائی نہیں دی۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ اس کے سامراجی مزاج کا ڈیڑھ صدی سے خاصہ رہا ہے، اس نے اپنے طرز عمل کا فیصلہ کر لیا، اور بغیر اس کے کہ کسی شکل اور کسی درجے تک بھی ہندوستان کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیا گیا ہو، لڑائی میں اس کے شامل ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس بات تک کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ ان نمائندہ اسمبلیوں ہی کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا ایک موقعہ دے دیا جائے۔ جسے خود برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی بخششوں کی نمائش کرتے ہوئے ہندوستان کے سر تھوپا ہے!

تمام دنیا کی طرح ہمیں بھی معلوم ہے، کہ اس موقعہ پر

برٹش امپائر کے تمام ملکوں کو اپنے اپنے طرز عمل کے فیصلہ کا کس طرح موقعہ دیا گیا تھا۔ کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزیلینڈ جنوبی افریقہ، آئرلینڈ، سب نے لڑائی میں شریک ہونے کا فیصلہ اپنی اپنی قانون ساز مجلسوں میں بغیر کسی باہر کی مداخلت کے کیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ آئرلینڈ نے شریک ہونے کی جبگہ غیر جانب دار رہنے کا فیصلہ کیا، اور اُس کے اس فیصلے پر برطانیہ کے کسی باشندے کو تعجب نہیں ہوا۔ مسٹر ڈی ولیرا نے برطانیہ کے ہمسایہ میں کھڑے ہوکر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک آلسٹر (Ulster) کا سوال قابل اطمینان طریقہ پر طے نہیں ہوتا، وہ برطانیہ کی مدد کرنے سے انکار کرتا ہے!

لیکن برطانوی نوآبادیوں (Dominions) کے اس پورے مرقع میں ہندوستان کی جگہ کہاں دکھائی دے رہی ہے؟ جس ہندوستان کو آج یہ قیمتی خوش خبری سنائی جارہی ہے، کہ اُسے برطانوی حکومت کے فیاض ہاتھوں سے جلد مگر کسی نامعلوم زمانے میں برطانوی نوآبادیوں (Dominions) کا درجہ (Status) ملنے والا ہے، اُس کی ہستی کا کیونکر اعتراف کیا گیا؟ اس طرح، کہ اُسے دُنیا کی

تاریخ کی شاید سب سے بڑی بننے والی لڑائی میں اچانک ڈھکیل دیا گیا، بغیر اس کے کہ اُسے معلوم بھی ہوا ہو کہ وہ لڑائی میں شریک ہو رہا ہے!

صرف یہی ایک واقعہ اس کے لئے کافی ہے کہ برطانوی حکومت کے موجودہ مزاج اور رُخ کو ہم اُس کے اصلی رنگ روپ میں دیکھ لیں۔ مگر نہیں، ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ ہمیں اور موقعے بھی پیش آنے والے ہیں۔ وہ وقت دُور نہیں جب ہم اُسے اور زیادہ نزدیک سے، اور اور زیادہ بے پردہ دیکھنے لگیں گے!

سنہ ۱۹۱۴ء کی لڑائی کی پہلی چنگاری بلقان کے ایک گوشہ میں سُلگی تھی۔ اس لئے انگلستان اور فرانس نے چھوٹی قوموں کے حقوق کا نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ پھر یا دش بخیر، پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ نکتے دُنیا کے سامنے آئے۔ اور ان کا جو کچھ حشر ہوا، دُنیا کو معلوم ہے۔ اس مرتبہ صورتِ حال دوسری تھی۔ پچھلی لڑائی کے بعد انگلستان اور فرانس نے اپنی فتحمندی کے نشے میں مخمور ہو کر جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ایک نیا ردِّ فعل (Reaction) شروع ہو جائے۔ وہ شروع ہوا۔ اُس نے اٹلی میں فیشسزم اور جرمنی میں نازیزم کا روپ اختیار کیا۔ اور وحشیانہ طاقت کی بنیادوں پر بے روک آمریت (Dictatorship) دُنیا کے امن اور آزادی کو چیلنج دینے لگی۔ جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تو قدرتی طور پر دو نئی صفیں دُنیا کے سامنے آ کھڑی ہوئیں ایک جمہوریت اور آزادی کا ساتھ دینے والی۔ دوسری ارتجاعی (Reactionary) قوتوں کو آگے

بڑھانے والی۔ اور اس طرح لڑائی کا ایک نیا نقشہ بننا شروع ہوگیا۔
مسٹر چیمبرلین کی حکومت جس کے لئے فسسٹ اٹلی اور نازی جرمنی سے
کہیں زیادہ سوویٹ روس کی ہستی ناقابل برداشت تھی، اور جو اُسے
برطانی سامراج کے لیئے ایک زندہ چیلنج سمجھتی تھی، تین برسوں تک
اس منظر کا تماشا دیکھتی رہی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اس نے اپنے طرز
عمل سے کھلے طور پر فیشسٹ اور نازی قوتوں کی جرأتیں ایک کے
بعد ایک بڑھائیں۔ ابے سینیا، اسپین، آسٹریا، چیکو سلاواکیا، اور
البانیا، کی ہستیاں ایک کے بعد ایک دُنیا کے نقشے سے مٹتی گئیں۔
اور برطانوی حکومت نے اپنی ڈگمگاتی ہوئی پالیسی سے انھیں دفن
کرنے میں برابر مدد دی۔ لیکن جب اس طرز عمل کا قدرتی نتیجہ اپنے
انتہائی شکل میں اُبھر آیا۔ اور نازی جرمنی کا قدم بے روک آگے
بڑھنے لگا، تو برطانوی حکومت بالکل بے بس ہوگئی۔ اُسے لڑائی
کے میدان میں اُترنا پڑا۔ کیونکہ اگر اب نہ اُترتی، تو جرمنی کی طاقت
برطانوی شہنشاہی کے لئے ناقابل برداشت ہوجاتی۔ اب چھوٹی قوموں
کی آزادی کے پُرانے نعرے کی جگہ "جمہوریت"، "آزادی اور عالمگیر
امن کے نئے نعروں نے لے لی، اور تمام دُنیا ان صداؤں سے
گونجنے لگی۔ ۳۔ستمبر کا اعلان جنگ انگلستان اور فرانس نے ان ہی
صداؤں کی گونج میں کیا۔ اور دُنیا کی اُن تمام بے چین روحوں
نے جو یورپ کی نئی ارتجاعی (Reactionary) قوتوں کی وحشیانہ
زور آزمائیوں اور عالمگیر بدامنی کے عذاب سے حیران اور سراسیمہ
ہورہی تھیں، ان خوشنما صداؤں پر کان لگا دیئے!

کانگرس کا مطالبہ

۳ ستمبر ۳۹ء کو لڑائی کا اعلان ہوا۔ اور ۷ ستمبر کو آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی واردھا میں اکٹھی ہوئی۔ تاکہ صورت حال پر غور کرے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس موقعہ پر کیا کیا؟ کانگرس کے وہ تمام اعلان اُس کے سامنے تھے جو ۳۶ء سے لگاتار ہوتے رہے ہیں۔ اعلان جنگ کے بارے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا تھا، وہ بھی اُن کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ یقیناً اُسے ملامت نہیں کیا جا سکتا تھا، اگر وہ کوئی ایسا فیصلہ کر دیتی، جو اس صورت حال کا منطقی نتیجہ تھا۔ لیکن اُس نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کی۔ اُس نے وقت کے اُن تمام جذبوں سے جو تیز رفتاری کا تقاضہ کر رہے تھے، اپنے کانوں کو بند کر لیا۔ اس نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر پورے سکون کے ساتھ غور کر کے وہ قدم اُٹھایا جسے آج ہندوستان سر اُٹھا کر دُنیا سے کہہ سکتا ہے، کہ اس صورت حال میں اُس کے لئے وہی ایک ٹھیک قدم تھا۔ اس نے اپنے سارے فیصلے ملتوی کر دیئے۔ اُس نے برطانوی حکومت سے سوال کیا کہ وہ پہلے اپنا فیصلہ دُنیا کے سامنے رکھ دے جس پر نہ صرف ہندوستان کا، بلکہ دُنیا کے امن و انصاف کے سارے مقصدوں کا فیصلہ موقوف ہے۔ اگر اس لڑائی میں شریک ہونے کی ہندوستان کو دعوت دی گئی ہے تو ہندوستان کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ لڑائی کیوں لڑی جا رہی ہے؟ اُس کا مقصد کیا ہے؟ اگر انسانی ہلاکت

کی اس سب سے بڑی المنا کی (Tragedy) کا بھی وہی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے، جو پچھلی لڑائی کا نکل چکا ہے، اور یہ واقعی اسلیئے لڑی جا رہی ہے، کہ آزادی، جمہوریت، اور امن کے ایک نئے نظم (Order) سے دُنیا کو آشنا کیا جائے۔ تو پھر یقیناً ہندوستان کو اس مطالبے کا حق حاصل ہے۔ کہ وہ معلوم کرے، خود اس کی قسمت پر ان مقصدوں کا کیا اثر پڑے گا؟

ورکنگ کمیٹی نے اپنے اس مطالبہ کو ایک مفصل اعلان کی صورت میں مرتب کیا۔ اور ۱۴۔ستمبر ۳۹ء کو یہ شائع ہو گیا۔ اگر میں اُمید کروں کہ یہ اعلان ہندوستان کی نئی سیاسی تاریخ میں اپنے لیئے ایک مناسب جگہ کا مطالبہ کرے گا تو مجھے یقین ہے، میں آنے والے مورّخ سے کوئی بیجا توقع نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سچائی اور معقولیت (Reason) کا ایک سادہ مگر نا قابل رد نوشتہ (Document) ہے، جس کو صرف مسلّح طاقت کا بے پروا گھمنڈ ہی رد کر سکتا ہے۔ اس کی آواز اگرچہ ہندوستان میں اُٹھی، لیکن فی الحقیقت یہ صرف ہندوستان ہی کی آواز نہ تھی۔ یہ عالمگیر انسانیت کی زخمی اُمیدوں کی چیخ تھی۔ پچیس برس ہوئے، کہ دُنیا بربادی اور ہلاکت کے ایک سب سے بڑے عذاب میں، جسے تاریخ کی نگاہیں دیکھ سکی ہیں، بتلا کی گئی، اور صرف اس لیئے بتلا کی گئی، تاکہ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ ایک سخت عذاب کی تیاریوں میں لگ جائے۔ کمزور قوموں کی آزادی، امن کی ضمانت، خود اختیاری فیصلہ

ہتھیاروں کی حد بندی، بین الاقوامی (Self-Determination)
(International) پنچایت کا قیام، یہ اور اسی طرح کے سارے
اونچے اور خوش نما مقصدوں کی صداؤں سے قوموں کے کانوں پر
جادو کیا گیا۔ ان کے دلوں میں اُمیدیں سُلگا دی گئیں۔ مگر بالآخر کیا
نتیجہ نکلا؟ ہر صدا فریب نکلی۔ ہر جلوہ خواب و خیال ثابت ہوا!
آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی پولنا کیوں میں دھکیلا
جا رہا ہے۔ کیا معقولیت (Reason) اور حقیقت کی موجودگی
سے ہمیں اس درجہ مایوس ہو جانا چاہیئے، کہ ہم موت اور بربادی کے
سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ کیوں
ہو رہا ہے؟ اور خود ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

برطانوی حکومت کا جواب اور کانگرس کا پہلا قدم

کانگرس کے اس مطالبہ کے جواب میں برطانوی حکومت کی
جانب سے بیانوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، جو ہندوستان
اور انگلستان میں ہوتے رہے۔ اس سلسلے کے لئے پہلی کڑی وائسرائے
ہند کا وہ اعلان ہم پہنچاتا ہے جو ۱۷۔ اکتوبر کو دہلی سے شائع
ہوا۔ یہ اعلان جو غالباً حکومت ہند کے سرکاری علم ادب
(Official Literature) کے الجھے ہوئے انداز، اور تھکا دینے والی
طوالت کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ ہے، صفحوں کے صفحے پڑھ جانے
کے بعد بھی اس قدر بتانے پر مشکل آمادہ ہوتا ہے، کہ لڑائی
کے مقصد کے لئے برطانوی وزیر اعظم کی ایک تقریر پڑھنی

چاہئے۔ جو صرف یورپ کے امن اور بین الاقوامی (International) رشتوں کی درستگی کا ذکر کرتی ہے۔ "جمہوریت" اور "قوموں کی آزادی" کے لفظ اس میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے جہانتک ہندوستان کے مسئلہ کا تعلق ہے، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ۱۹۱۹ء کے قانون کی تمہید میں اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا تھا اور جس کا نتیجہ ۳۵ء کے قانون کی شکل میں نکلا، آج بھی وہی پالیسی اُس کے سامنے ہے۔ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔

۱۷ر اکتوبر ۳۹ء کو وائسرائے کا اعلان شائع ہوا، اور ۲۲ر کو ورکنگ کمیٹی اُس پر غور کرنے کے لئے واردھا میں بیٹھی۔ وہ بغیر کسی بحث کے اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ جواب کسی طرح بھی اُسے مطمئن نہیں کرسکتا، اور اب اُسے اپنا وہ فیصلہ بلا تامّل کردینا چاہیئے جو اس وقت تک اس نے ملتوی کر رکھا تھا۔ جو فیصلہ کمیٹی نے کیا، وہ اُس کی تجویز کے لفظوں میں یہ ہے:۔

"ان حالات میں کمیٹی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ برطانوی حکومت کی سامراجی پالیسی کو منظور کرے۔ کمیٹی کانگرس وزارتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ جو راہ اب ہمارے سامنے کھل گئی ہے، اس کی طرف بڑھتے ہوئے بطور ایک ابتدائی قدم کے اپنے اپنے صوبوں کی حکومتوں سے مستعفی ہو جائیں"

چنانچہ آٹھوں صوبوں میں وزارتوں نے استعفا دے دیا۔

یہ تو اس سلسلہ کی ابتدا تھی۔ اب دیکھنا چاہئے کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ ترقی کر کے کہاں تک پہنچتا ہے۔؟ وائسرائے ہند کا ایک کمیونکے جو ۵؍ فروری کو دہلی سے شائع ہوا اور جو اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہے جو مہاتما گاندھی سے ہوئی تھی اور پھر خود مہاتما گاندھی کا بیان جو انھوں نے ۸؍ فروری کو شائع کیا، اسکی آخری کڑی سمجھی جا سکتی ہے۔ اس کا خلاصہ ہم سب کو معلوم ہے۔ برطانوی حکومت اس بات کی پوری خواہش رکھتی ہے کہ ہندوستان جلد سے جلد وقت میں جو صورتِ حال کے لحاظ سے ممکن ہو برطانوی نو آبادیوں کا درجہ حاصل کر لے، اور درمیانی زمانے کی مدت جہاں تک ممکن ہو کم کی جائے، مگر وہ ہندوستان کا یہ حق ماننے کے لئے تیار نہیں کہ بغیر باہر کی مداخلت کے وہ اپنا دستورِ اساسی (کانسٹی ٹیوشن) خود اپنے چنے ہوئے باشندوں کے ذریعہ بنا سکتا ہے، اور اپنی قسمت کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں برطانوی حکومت ہندوستان کے لئے خود اختیاری فیصلے (Self-Determination) کا حق تسلیم نہیں کر سکتی۔

حقیقت کی ایک چھوت (Touch) سے دکھاوے کا سارا طلسم کس طرح نابود ہو گیا! پچھلے چار برسوں سے جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کے نعروں سے دُنیا گونج رہی تھی۔ انگلستان اور فرانس کی حکومتوں کی زیادہ سے زیادہ ذمّہ دار زبانیں اس بارے میں جو کچھ کہتی رہی ہیں، وہ ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں، مگر جونہی ہندوستان نے یہ سوال اُٹھایا، حقیقت کو بے پردہ ہو کر سامنے آجانا پڑا۔ اب

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قوموں کی آزادی کی حفاظت بلاشبہ اس لڑائی کا مقصد ہے۔ مگر اس کا دائرہ یورپ کی جغرافیائی حدود سے باہر نہیں جا سکتا۔ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو یہ جرأت نہیں کرنی چاہئے کہ اُمید کی نگاہ اُٹھائیں۔ مسٹر چمبرلین نے ۲۴ فروری کو برمنگھم میں تقریر کرتے ہوئے یہ حقیقت اور زیادہ واضح کر دی ہے، اگرچہ ان کی تقریر سے پہلے بھی ہمیں اس بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ انھوں نے ہمارے لئے برطانوی حکومت کے صاف طرز عمل کے ساتھ صاف قول بھی بہم پہنچا دیا۔ وہ لڑائی کے برطانوی مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے دُنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں:۔ ”ہماری لڑائی اس لئے ہے کہ ہم اس امر کی ضمانت حاصل کرلیں کہ یورپ کی چھوٹی قومیں آئندہ اپنی آزادی کو بے جا زیادتیوں کی دھمکیوں سے بالکل محفوظ پائیں گی۔“

برطانوی حکومت کا یہ جواب اس موقعہ پر اگرچہ برطانی زبان سے نکلا ہے، مگر فی الحقیقت وہ اپنی قسم میں خالص برطانی نہیں ہے۔ بلکہ ٹھیک ٹھیک براعظم یورپ کی اُس عام ذہنیت کی ترجمانی کر رہا ہے، جو تقریباً دو صدیوں سے دُنیا کے سامنے رہی ہے۔ اٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں انسان کے انفرادی اور جماعتی آزادی کے جس قدر اصول قبول کئے گئے، ان کے مطالبے کا حق صرف یورپی قوموں ہی کے لئے خاص سمجھا گیا، اور یورپ کی قوموں میں بھی مسیحی یورپ

کے تنگ دائرے سے کبھی باہر نہ جا سکا - آج بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دنیا
اسقدر بدل چکی ہے کہ پچھلی صدی کے فکر اور عمل کے نقشے تاریخ کی پرانی کہانیوں کی طرح
سامنے آتے ہیں، اور ہمیں ان نشانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں جنھیں ہم بہت دور
پیچھے چھوڑ آئے - لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ کم ازکم ایک نشان اب بھی ہمارے
پیچھے نہیں ہے - وہ ہمارے ساتھ ساتھ آرہا تھا - وہ انسانی حقوق کے لئے
یورپ کا امتیازی نشان ہے -

ٹھیک ٹھیک معاملہ کا ایسا ہی نقشہ ہندوستان کے سیاسی اور
قومی حق کے سوال نے بھی ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے - ہم نے جب اعلان جنگ
کے بعد یہ سوال اُٹھایا کہ لڑائی کا مقصد کیا ہے، اور ہندوستان کی قسمت پر
اس کا کیا اثر پڑنے والا ہے؟ تو ہم اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ برطانوی
حکومت کی پالیسی سنہ ۱۴ء اور سنہ ۱۹ء میں کیا رہ چکی ہے - ہم معلوم کرنا چاہتے
تھے کہ سنہ ۳۹ء کی اُس دنیا میں جو دلوں کے اندر صدیوں کی چال سے بدلتی
اور پلٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے، ہندوستان کو برطانوی حکومت کس جگہ سے دیکھنا
چاہتی ہے؟ اُس کی جگہ اب بھی بدلی ہے یا نہیں؟ ہمیں صاف جواب
مل گیا کہ نہیں بدلی - وہ اب بھی اپنے سامراجی مزاج میں کوئی تبدیلی
پیدا نہیں کر سکی ہے - ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت بہت
زیادہ اس کی خواہشمند ہے کہ ہندوستان جہاں تک جلد ممکن ہو نوآبادیات
(Dominion Status) کا درجہ حاصل کرے - ہمیں معلوم تھا کہ برطانوی
حکومت نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی ہے - اب ہمیں یہ بات بھی
معلوم ہوگئی کہ وہ اس کی بہت زیادہ خواہشمند ہے!! مگر سوال برطانوی
حکومت کی خواہش اور اُس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے صاف

اور سادہ سوال ہندوستان کے حق کا ہے۔ ہندوستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے؟ اسی سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہے۔ ہندوستان کے لئے یہ سوال بنیادی کی اصلی اینٹ ہے۔ وہ اِسے نہیں ہلنے دیگا۔ اگر یہ ہل جائے تو اسکی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائے گی؟

جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے ہمارے لئے صورت حال بالکل واضح ہوگئی۔ ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اُسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتحمندیوں کے لئے لڑائی میں حصّہ لیں۔ ہمارا مقدّمہ بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومیّت کی عمر بڑھانے کے لئے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتحمند نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مقابل سمت جا رہی ہے۔

ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟

اب ہم اُس جگہ پر واپس آجائیں جہاں سے ہم چلے تھے۔ ہم نے اس سوال پر غور کرنا چاہا تھا کہ ۳ ستمبر کے اعلان جنگ کے بعد جو قدم ہم اٹھا چکے ہیں اس کا رخ کس طرف ہے؟ اور ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اس طرح صاف صاف اُبھر آیا ہوگا کہ اب اُسے حرف زبانوں تک پہنچنا ہی باقی رہ گیا

ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کے لب ہلیں، میں آپ کے دلوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے عارضی تعاون (Cooperation) کا جو قدم ۱۹۳۷ء میں اُٹھایا تھا، ہم نے اعلان جنگ کے بعد واپس لے لیا۔ اس لئے قدرتی طور پر ہمارا رُخ ترک تعاون (Non-Cooperation) کی طرف تھا۔ ہم آج اُس جگہ کھڑے ہیں جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اُس رُخ کی طرف آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں۔ جب قدم اُٹھا دیا جائے تو وہ رُک نہیں سکتا۔ اگر رُکے گا تو پیچھے ہٹے گا۔ ہم پیچھے ہٹنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ آگے بڑھیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ سب کے دلوں کی آواز اپنی آواز کے ساتھ ملا رہا ہوں، جب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم آگے بڑھیں گے!

باہمی مفاہمت

اس سلسلے میں قدرتی طور پر ایک سوال سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی کشمکش میں ایک طاقت جبھی اپنا قبضہ چھوڑ سکتی ہے، جبکہ دوسری طاقت اُسے ایسا کرنے پر مجبور کر دے۔ اور معقولیت اور اخلاق کے اعلیٰ اصول افراد کا طرز عمل بدلتے رہے ہیں، مگر غلبہ حاصل ہونی قوموں کی خود غرضیوں پر کبھی اثر نہیں ڈال سکے۔ آج بھی ہم عین بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کی نئی ارتجاعی (Reactionary) قوموں نے کس طرح انسان کے انفرادی اور قومی حقوق کے

تمام عقیدے تہہ و بالا کر دئے، اور انصاف اور معقولیت
(Reason) کی جگہ صرف وحشیانہ طاقت کی دلیل فیصلوں کے
لئے اکیلی دلیل رہ گئی۔ لیکن ساتھ ہی جہاں دنیا تصویر کا یہ مایوس
رُخ اُبھار رہی ہے، وہاں اُمید کا ایک دوسرا رُخ بھی نظر انداز
نہیں کیا جاسکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلا امتیاز دنیا کے بے شمار
انسانوں کی ایک نئی عالمگیر بیداری بھی ہے۔ جو نہایت تیزی کے
ساتھ ہر طرف اُبھر رہی ہے۔ یہ دنیا کے پُرانے نظم (Order)
کی نامرادیوں سے تھک گئی ہے، اور معقولیت، انصاف، اور امن
کے ایک نئے نظم کے لئے بیقرار ہے۔ دنیا کی یہ نئی بیداری جس
نے پچھلی لڑائی کے بعد سے انسانی روحوں کی گہرائیوں میں کروٹ
بدلنا شروع کر دیا تھا، اب روز بروز دماغوں اور زبانوں
کی سطح پر اُبھر رہی ہے، اور اس طرح اُبھر رہی ہے کہ شاید
تاریخ میں کبھی نہیں اُبھری۔ ایسی حالت میں کیا یہ بات وقت کے
امکانوں کے دائرے سے باہر تھی کہ تاریخ میں اس کے پُرانے فیصلوں
کے خلاف ایک نئے فیصلے کا اضافہ ہوتا؟ کیا ممکن نہیں کہ دنیا کی
دو بڑی قومیں جنھیں حالات کی رفتار نے حکومت اور محکومیت
کے رشتے سے جمع کر دیا تھا، آئندہ کے لئے معقولیت، انصاف
اور امن کے رشتوں سے اپنا نیا تعلق جوڑنے کے لئے تیار
ہو جائیں؟ عالمگیر جنگ کی مایوسیاں کس طرح اُمیدوں کی ایک
نئی زندگی میں بدل جاتیں، معقولیت اور انصاف کے دور کی
ایک نئی صبح کس طرح دنیا کو ایک نئے سورج کا پیام دینے لگتی،

انسانیت کی کیسی بے مثال اور عالمگیر فتحمندی ہوتی، اگر آج برطانی قوم سر اُٹھاکر دنیا سے کہہ سکتی کہ اُس نے تاریخ میں ایک نئی مثال بڑھانے کا کام انجام دے دیا ہے!

یقیناً یہ ناممکن نہیں ہے، مگر دُنیا کی تمام دشواریوں سے کہیں دشوار ہے!

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا یہی ایک روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔ وہ باہمی مفاہمت کے دروازے میں جو اُن پر کھولا جاتا ہے، بغیر اسکے کہ اپنی جگہ کو ذرا بھی کمزور محسوس کریں بلا تامل قدم رکھنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔

برطانوی کابینہ (Cabinet) کے متعدد ممبروں نے لڑائی کے بعد دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ برطانوی سامراج کا پچھلا دَور اب ختم ہوچکا، اور آج برطانوی قوم صرف امن اور انصاف کے مقصدوں کو اپنے سامنے رکھتی ہے۔ ہندوستان سے بڑھ کر اور کونسا ملک ہوسکتا ہے جو آج کسی ایسے اعلان کا استقبال کرتا؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ باوجود ان اعلانوں کے برطانوی سامراج آج بھی اُسی طرح امن اور انصاف کی راہ روکے کھڑا ہے جس طرح لڑائی سے پہلے تھا۔ ہندوستان کا مطالبہ اس طرح کے تمام دعوؤں کے لئے ایک حقیقی کسوٹی تھی۔ دعوے کسوٹی پر کسے گئے، اور اپنی سچائی کا ہمیں یقین نہ دلا سکے!

ہندوستان کا سیاسی مستقبل اور اقلیتیں

جہاں تک وقت کے اصلی سوال کا تعلق ہے، معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو میں نے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیا۔ گذشتہ ستمبر میں جب اعلان جنگ کے بعد کانگریس نے اپنا مطالبہ ترتیب دیا، تو اُس وقت ہم میں سے کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں گذری تھی کہ اس صاف اور سادہ مطالبہ میں جو ہندوستان کے نام پر کیا گیا ہے اور جس سے ملک کے کسی فرقہ اور کسی گروہ کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا، فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال اُٹھایا جا سکے گا۔ بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں جو سیاسی جد و جہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکتیں جہاں تک کانگریس کے قدم پہنچ گئے ہیں اور براہِ راست اقدام عمل (ڈائرکٹ ایکشن) کے طریقہ سے جو سیاسی ہندوستان کی اکثریت نے اختیار کر لیا ہے، متفق نہیں ہیں۔ لیکن جہاں تک ملک کی آزادی اور اُس کے قدرتی حق کے اعتراف کا تعلق ہے، ہندوستان کی ذہنی بیداری اب اُن ابتدائی منزلوں سے بہت دور نکل چکی کہ ملک کا کوئی گروہ بھی اِس مقصد سے اختلاف کرنے کی جرأت کر سکے۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کے لئے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورتِ حال کی تبدیلی کے خواہشمند نہ ہوں، وقت کی عام آب و ہوا کے تقاضہ سے بے بس ہو رہی ہیں اور انھیں بھی ہندوستان کی سیاسی منزلِ مقصود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جہاں وقت کے آزمائشی سوال نے صورتِ حال کے دوسرے گوشوں پر سے پردے اُٹھا دیئے، وہاں اس گوشے کو بھی بے نقاب کر دیا۔ ہندوستان اور انگلینڈ، دونوں جگہ یکے بعد دیگرے اس طرح کی کوششیں کی گئیں کہ وقت کے سیاسی سوال کو فرقہ وارانہ مسئلہ کے ساتھ خلط ملط کر کے سوال کی اصلی حیثیت

مشتبہ کردی جائے۔ بار بار دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے حل کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ حارج ہو رہا ہے۔

اگر پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا یہ طرز عمل رہ چکا ہے کہ ملک کے باشندوں کے اندرونی اختلافات کو اُبھار کر نئی نئی صفوں میں تقسیم کیا جائے اور پھر اُن صفوں کو اپنی حکومت کے استحکام کے لئے کام میں لائے تو یہ ہندوستان کی سیاسی محکومیت کا ایک قدرتی نتیجہ تھا، اور ہمارے لئے اب بے سود ہے کہ اس کی شکایت سے اپنے جذبات میں کڑواہٹ پیدا کریں۔ ایک اجنبی حکومت یقیناً اُس ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہشمند نہیں ہوسکتی جس کی اندرونی پھوٹ ہی اُس کی موجودگی کے لئے سب سے بڑی ضمانت ہے۔ لیکن ایک ایسے زمانہ میں جبکہ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوششیں کی جارہی ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت کی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم ہو چکا، یقیناً یہ کوئی بڑی توقع نہ تھی اگر ہم برطانوی مدبروں سے امید رکھتے تھے کہ کم از کم اِس گوشے میں وہ اپنے طرز عمل کو پچھلے عہد کی دماغی وراثت سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن پچھلے پانچ مہینوں کے اندر واقعات کی جو رفتار رہ چکی ہے اُس نے ثابت کر دیا کہ ابھی ایسی امیدوں کے رکھنے کا وقت نہیں آیا، اور جس دَور کی نسبت دنیا کو یقین دلایا جارہا ہے کہ ختم ہوگیا، اُسے ابھی ختم ہونا باقی ہے۔

بہر حال اسباب خواہ کچھ ہی رہے ہوں لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اپنے اندرونی مسائل رکھتا ہے، اور ان مسئلوں میں ایک اہم مسئلہ فرقہ دارانہ مسئلہ کا ہے۔ ہم برطانوی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتے اور ہمیں رکھنی بھی نہیں چاہئے کہ وہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرے گی۔ یہ مسئلہ موجود ہے، اور اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض

ہے کہ اس کی موجودگی مان کر قدم اُٹھائیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قدم جو اس کی موجودگی سے بے پرواہ ہو کر اُٹھے گا، یقیناً ایک غلط قدم ہوگا۔ لیکن فرقہ دارانہ مسئلہ کی موجودگی کے اعتراف کے معنی صرف یہی ہونے چاہئیں کہ اُس کی موجودگی کا اعتراف کیا جائے۔ یہ معنی نہیں ہونے چاہئیں کہ اُسے ہندوستان کے قومی حق کے خلاف بطور ایک آلہ کے استعمال کیا جائے۔ برطانوی شہنشاہی ہمیشہ اس مسئلہ کو اسی غرض سے کام میں لاتی رہی۔ اگر اب وہ اپنی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم کرنے پر مائل ہے، تو اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ سب سے پہلا گوشہ جس میں ہم قدرتی طور پر اس تبدیلی کی جھلک دیکھنی چاہیں گے، وہ یہی گوشہ ہے۔

کانگریس نے فرقہ دارانہ مسئلہ کے بارے میں اپنے لئے جو جگہ بنائی ہے وہ کیا ہے؟ کانگریس کا اوّل دن سے دعوا رہا ہے کہ وہ ہندوستان کو بحیثیت مجموعی اپنے سامنے رکھتی ہے، اور جو قدم بھی اُٹھانا چاہتی ہے، ہندوستانی قوم کے لئے اٹھانا چاہتی ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ کانگریس نے یہ دعوا کرکے دنیا کو اس بات کا حق دیدیا ہے کہ وہ جس قدر بے رحم نکتہ چینی کے ساتھ چاہے اُس کے طرزِ عمل کا جائزہ لے اور کانگریس کا فرض ہے کہ اس جائزہ میں اپنے کو کامیاب ثابت کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ معاملہ کا یہ پہلو سامنے رکھ کر ہم آج کانگریس کے طرزِ عمل پر نئے سرے سے ایک نگاہ ڈال لیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا ہے، اس بارے میں قدرتی طور پر تین باتیں ہی سامنے آسکتی ہیں۔ فرقہ دارانہ مسئلہ کی موجودگی۔ اس کی اہمیت۔ اُس کے فیصلے کا طریقہ۔

کانگریس کی پوری تاریخ اسکی گواہی دیتی ہے کہ اُس نے اس مسئلہ کی موجودگی کا ہمیشہ اعتراف کیا۔ اس نے اسکی اہمیت کو گھٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اُس نے اس کے فیصلہ کے لئے وہی طریقہ تسلیم کیا جس سے زیادہ قابل اطمینان طریقہ اس بارے میں کوئی نہیں بتلایا جاسکتا، اور اگر بتلایا جاسکتا ہے، تو اسکی طلب میں اسکے دونوں ہاتھ ہمیشہ بڑھے رہے اور آج بھی بڑھے ہوئے ہیں!

اسکی اہمیت کا اعتراف اس سے زیادہ ہمارے تخئیل پر کیا اثر ڈال سکتا ہے کہ اسے ہندوستان کے قومی مقصد کی کامیابی کے لئے سب سے پہلی شرط یقین کریں ؟ مَیں اس واقعہ کو بطور ایک ناقابل انکار حقیقت کے پیش کروں گا کہ کانگرس کا ہمیشہ ایسا ہی یقین رہا۔

کانگریس نے ہمیشہ اس بارے میں دو بُنیادی اصول اپنے سامنے رکھے اور جب کبھی کوئی قدم اُٹھایا تو ان دونوں اصولوں کو صاف صاف اور قطعی شکل میں مان کر اُٹھایا ہے۔

۱۔ ہندوستان کا جو دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) بھی آئندہ بنایا جائے، اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیئے۔

۲۔ اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے لئے کن کن تحفظات (سیف گارڈز) کی ضرورت ہے ؟ اسکے لئے جج خود اقلیتیں ہیں، نہ کہ اکثریتیں۔ اس لئے تحفظات کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیئے۔ نہ کہ کثرت رائے سے۔

اقلیتوں کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ دُنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی رہ چکا ہے۔ میں آج اس جگہ سے دُنیا کو مخاطب کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی صاف اور بے لاگ طرزِ عمل اس بارے میں اختیار کیا جا سکتا ہے ؟ اگر کیا جا سکتا ہے تو وہ کیا ہے ؟ کیا اس طرزِ عمل میں کوئی بھی ایسی خامی رہ گئی ہے جس کی بنا پر کانگرس کو اس کا فرض یاد دلانے کی ضرورت ہو ؟ کانگرس اپنے اداءِ فرض کی خامیوں پر غور کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہی ہے اور آج بھی تیار ہے۔

میں انیس برس سے کانگرس میں ہوں۔ اس تمام عرصے میں

کانگرس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں ہوا جس کے ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس انیس[19] برس میں ایک دن بھی ایسا کانگرس کے دماغ پر نہیں گزرا جب اس نے اس مسئلہ کا فیصلہ اسکے سوا کسی طریقہ سے بھی کرنے کا خیال کیا ہو۔ یہ صرف اُس کا اعلان ہی نہ تھا۔ اُس کا مضبوط اور طے کیا ہوا طرز عمل تھا۔ پچھلے پندرہ برسوں کے اندر بار بار اس طرز عمل کے لئے سخت سے سخت آزمائشیں پیدا ہوئیں، مگر یہ چٹان اپنی جگہ سے کبھی نہ ہل سکی۔

آج بھی اس نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹوانٹ اسمبلی) کے سلسلے میں اس مسئلہ کا جس طرح اعتراف کیا ہے، وہ اس کے لئے کافی ہے کہ ان دونوں اصولوں کو ان کی زیادہ سے زیادہ صاف شکل میں دیکھ لیا جائے۔ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمائندوں کو چن کر بھیجیں۔ اُن کے نمائندوں کے کاندھوں پر اپنے فرقہ کی رائوں کے سوا اور کسی کی رائے کا بوجھ نہ ہوگا۔ جہاں تک اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کا تعلق ہے، فیصلہ کا ذریعہ مجلس (اسمبلی) کی کثرت رائے نہیں ہوگی۔ خود اقلیتوں کی رضامندی ہوگی۔ اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہوسکے تو کسی غیر جانبدار پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کرایا جاسکتا ہے جسے اقلیتوں نے بھی تسلیم کرلیا ہو۔ آخری تجویز محض ایک احتیاطی پیش بندی ہے۔ ورنہ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس طرح کی صورتیں پیش آئیں گی۔ اگر اس تجویز کی جگہ کوئی دوسری قابل عمل تجویز ہوسکتی ہے تو اُسے اختیار کیا جاسکتا ہے۔

اگر کانگرس نے اپنے طرز عمل کے لئے یہ اصول سامنے رکھ لئے

ہیں، اور پوری کوشش کر چکی ہے اور کر رہی ہے کہ ان پر قائم رہے،
تو پھر اس کے بعد اور کونسی بات رہ گئی ہے جو برطانوی مدبّروں کو اس
پر مجبور کرتی ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ ہمیں بار بار یاد دلائیں؟
اور دُنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں کہ ہندوستان کے مسئلہ کی راہ میں
اقلیتوں کا مسئلہ راستہ روکے کھڑا ہے؟ اگر فی الحقیقت اسی مسئلہ کی
وجہ سے رُکاوٹ پیش آرہی ہے تو کیوں برطانوی حکومت ہندوستان
کی سیاسی قسمت کا صاف صاف اعلان کر کے ہمیں اس کا موقعہ نہیں
دے دیتی کہ ہم سب مل کر بیٹھیں اور باہمی رضا مندی سے اس مسئلہ کا
ہمیشہ کے لئے تصفیہ کرلیں؟

ہم میں تفرقے پیدا کئے گئے، اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم
میں تفرقے ہیں۔ ہمیں تفرقوں کے مٹانے کا موقعہ نہیں دیا جاتا، اور ہم سے
کہا جاتا ہے کہ ہمیں تفرقے مٹانے چاہئیں۔ یہ صورت حال ہے جو ہمارے
چاروں طرف پیدا کر دی گئی ہے۔ یہ بندھن ہیں جو ہمیں ہر طرف
سے جکڑے ہوئے ہیں۔ تاہم اس حالت کی کوئی مجبوری بھی ہمیں اس
سے باز نہیں رکھ سکتی کہ سعی اور ہمت کا قدم آگے بڑھائیں، کیونکہ ہماری
راہ تمام تر دشواریوں کی راہ ہے اور ہمیں ہر دشواری پر غالب آنا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان اور ہندوستان کا مستقبل

یہ ہندوستان کی اقلیتوں کا مسئلہ تھا۔ لیکن کیا ہندوستان میں
مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک
اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور وہ تمام اندیشے اپنے سامنے

لاسکتی ہے جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں؟

مجھے نہیں معلوم، آپ لوگوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزر چکی ہیں جو آج سے اٹھائیس برس پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں تو میں اُن سے درخواست کروں گا کہ اپنا حافظہ تازہ کرلیں۔ میں نے اُس زمانے میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا اور اُسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے، جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے۔ اور اسلئے انھیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق ومفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہئے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط بنیادوں پر غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کردی۔ دوسری طرف دُنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کردیا جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتلاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اُسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگرس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہوگیا

تھا، اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے اُبھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے۔ اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لئے متّحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے اس لئے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤنگا میں صرف اتنی بات آپ کو یاد دلا دوں گا کہ اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنی چاہتے ہیں تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور ایک سابق لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی (اب یونائٹیڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانے کی طرف لوٹنا چاہئے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے اُن میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتّے پیدا کئے اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں۔ مگر ابھی تک اس کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی!

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اُس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو، لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے اور اُسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہئے، بلکہ اِسے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت، دونوں

اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔اس حیثیت کے تصور کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ساتھ ہی اس میں تعداد (Number) کے ساتھ نوعیت (Kind) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔فرض کیجئے ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے۔دوسرے کی دو کروڑ ہے۔اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا، اور اس لئے دو کروڑ سے کم ہوگا، مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اسکی کمزور ہستی کا اعتراف کرلیں۔اس طرح کی اقلیت ہونے کے لئے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (Factors) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کرلیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اسکی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اسکی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی

تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے ۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک
کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی لیکن سوال
تعداد کی نسبت کا نہیں ہے، خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے کیا
انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لئے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز
وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق
و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کرسکے گی ؟

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک خاص
تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصّوں میں پھیل گئی ہے ۔ ہندوستان
کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریّت مسلمانوں
کی ہے، اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلّیت کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ اگر
برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کردیا جائے تو چار کی جگہ مسلم
اکثریّت کے پانچ صوبے ہوجائیں گے ۔ اگر ہم ابھی مجبور ہیں کہ مذہبی
تفریق کی بنا پر ہی "اکثریّت" اور "اقلّیت" کا تصور کرتے رہیں، تو
بھی اس تصوّر میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلّیت" کی دکھائی نہیں
دیتی ۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلّیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ
صوبوں میں انھیں اکثریّت کی جگہ حاصل ہے ۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ
نہیں کہ انھیں کو ایک اقلّیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کرسکے ۔

ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی (Constitution)
اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو، مگر اسکی ایک بات ہم سب کو
معلوم ہے ۔ وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (Federation)
کا جمہوری دستور ہوگا، جس کے تمام حلقے (Units) اپنے اپنے اندرونی

معاملات میں خود مختار ہوں گے، اور فیڈرل مرکز کے حصّے میں صرف وہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع (Defence) کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنے سامنے لاسکتا ہے، اُن اندیشوں کے قبول کرنے کے لئے تیار ہوجائے، جنھیں اکثریت اور اقلیت کے اس پُر فریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ میں ایک لمحہ کے لئے یہ باور نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کے مستقبل نقشے میں ان اندیشوں کے لئے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اسلئے پیدا ہو رہے ہیں کہ ایک برطانی مدبّر کے مشہور لفظوں میں جو اُس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے: ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں، اور گو تیرنا چاہتے ہیں مگر دریا میں اُترتے نہیں۔ ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ ہمیں دریا میں بےخوف وخطر کودنا چاہیئے۔ جوں ہی ہم نے ایسا کیا، ہم معلوم کرلیں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے!

مسلمانانِ ہند کے لئے ایک بُنیادی سوال

تقریباً تیس برس ہوئے جب میں نے بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے لئے اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدوجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی، اور عام طور پر وہی ذہنیت ہرطرف چھائی ہوئی

تھی جو ۱۸۸۸ء میں کانگرس سے علیحدگی اور مخالفت کی اختیار کر لی گئی تھی۔ وقت کی یہ عام آب و ہوا میرے غور و فکر کی راہ نہ روک سکی۔ میں بہت جلد ایک آخری نتیجہ تک پہنچ گیا اور اس نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھول دی۔ میں نے غور کیا کہ ہندوستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے، اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم بھی اسی کشتی میں سوار ہیں، اور اس کی رفتار سے بے پروا نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اپنے طرز عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کر لیں۔ یہ فیصلہ ہم کیونکر کر سکتے ہیں؟ صرف اس طرح، کہ معاملہ کی سطح پر نہ رہیں۔ اُس کی بنیادوں تک اُتریں، اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں۔ میں نے ایسا کیا، اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب پر موقوف ہے۔ ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں، یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے، تو بلاشبہ ہماری راہ بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان، آئندہ کا کوئی وعدہ، دستور اساسی کا کوئی تحفظ، ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ کسی تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اور ہمیں بھی یہی خواہش رکھنی چاہئے کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے۔ لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لئے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہئے تو پھر ہماری راہِ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے

عالم میں پائے لگتے ہیں شک، تذبذب، بے عملی، اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ یقین، جماؤ، عمل، اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ وقت کا کوئی ابھاؤ، حالات کا کوئی اُتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی چبھن، ہمارے قدموں کا رُخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہوجاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اُٹھائے بڑھے جائیں!

مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لئے ممکن نہ تھا کہ اس کا تصوّر بھی کرسکوں۔ میں کسی مسلمان کے لئے بشرطیکہ اُس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈ کر نکال نہ پھینکی ہو، یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت کرے!

میں نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا۔ اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ آپ کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ مسلمانانِ ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں جب میں چار برس کی نظربندی کے بعد میں رہا ہوا تو میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی ہے اور نیا سانچا ڈھل رہا ہے۔ اس واقعہ پر بیس برس گزر چکے۔ اس عرصہ میں طرح طرح کے اُتار چڑھاؤ ہوتے رہے۔ حالات کے نئے نئے سیلاب بہے۔ خیالات کی نئی نئی لہریں اٹھیں۔ تاہم ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے۔ مسلمانوں کی عام

راے پیچھے لوٹنے کے لئے تیار نہیں۔

ہاں، وہ اب پیچھے لوٹنے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن آگے بڑھنے کی راہ اُس پر پھر مشتبہ ہو رہی ہے میں اس وقت اسباب میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اثرات دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے اُنھیں مخاطب کیا تھا۔ آج بھی میں اُسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے، اُن میں کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے سے نہ گزری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات صرف میرے سامنے سے گزرتے ہی نہ رہے۔ میں اُن کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں میرے لئے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصے میں ان سے کہتا رہا ہوں، اور آج بھی اُن سے کہتا ہوں، کہ ہندوستان کے نوکروڑ مسلمانوں کے لئے صرف وہی ایک راہ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں اُنھیں دعوت دی تھی۔

میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا، مگر آج اُنھیں مجھ سے اختلاف ہے، میں اُنھیں اس اختلاف کے لئے ملامت نہیں کروں گا، مگر میں انکے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کروں گا یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہ کر طے نہیں کر سکتے۔ ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں۔ ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جا سکتیں۔ میں تسلیم کرتا

ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے مگر انھیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہئے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملے پر غور کر لیں۔ وہ اسکے سوا کوئی راہ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے۔

مسلمان اور متّحدہ قومیت

مَیں مسلمان ہوں، اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ مَیں تیار نہیں کہ اسکا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصّہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ اُس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے مَیں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اُس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مَیں ہندوستانی ہوں۔ مَیں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ مَیں اس متحدہ قومیّت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں، جسکے بغیر اسکی عظمت کا ہیکل ادھورا رہجاتا ہے۔ مَیں اسکی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں، مَیں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اُسکی سرزمین

انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں، اور مختلف مذہبوں کے
قافلوں کی منزل ہے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان
قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد سلسلہ جاری رہا۔ اسکی
وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی، اور اسکی فیاض گود نے سب
کے لئے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام
کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ
کے لئے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا
ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ
الگ بہتے رہے، لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک
سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔
جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اُسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے،
پُرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔

ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے، اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں
سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اسکے حوالے کر دی اور اس نے اپنے
خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیئے۔ ہم نے اُسے اسلام کے ذخیرے
کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی، جسکی اُسے سب سے
زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اُسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا
پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب
اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعوا رکھتا ہے جیسا دعوا ہندو مذہب کا ہے
اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے،

تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اسکے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔
جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے،
اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے
ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس
دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کرونگا۔ میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ
حق تسلیم کرونگا کہ وہ آج سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں
اور باشندگانِ ہند ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک ملی جلی تاریخ نے ہماری
ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔
ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق،
ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار
حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ
نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے
لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے
مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں
میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام
مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے، اور ہم اسے
چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی
زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں، جو چاہتے
ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں، تو انھیں معلوم
ہونا چاہئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں، اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔

اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اُس گزری ہوئی تہذیب معاشرت کو پھر تازہ کریں، جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے، تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے۔ اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔ میں اُن لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید (Revival) مذہب میں ضرورت ہے، مگر معاشرت میں ترقی سے انکار کرنا ہے۔

ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا۔ اور قسمت کی مہر اُس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علٰحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیئے، اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔

خاتمہ

حضرات! میں اب آپکا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں اب اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن قبل اسکے کہ ختم کروں، مجھے ایک بات کے یاد دلانے کی اجازت دیجئے۔ آج ہماری ساری کامیابیوں کا دار و مدار تین چیزوں پر ہے۔ اتحاد، ڈسپلن (Discipline) اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد۔ یہی ایک تنہا رہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر

کیا، اور صرف اسی سے ہم ایک فتحمند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔

ہماری آزمائش کا ایک نازک وقت ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے تمام دنیا کی نگاہوں کو نظارے کی دعوت دے دی ہے۔ کوشش کیجئے کہ ہم اسکے اہل ثابت ہوں۔
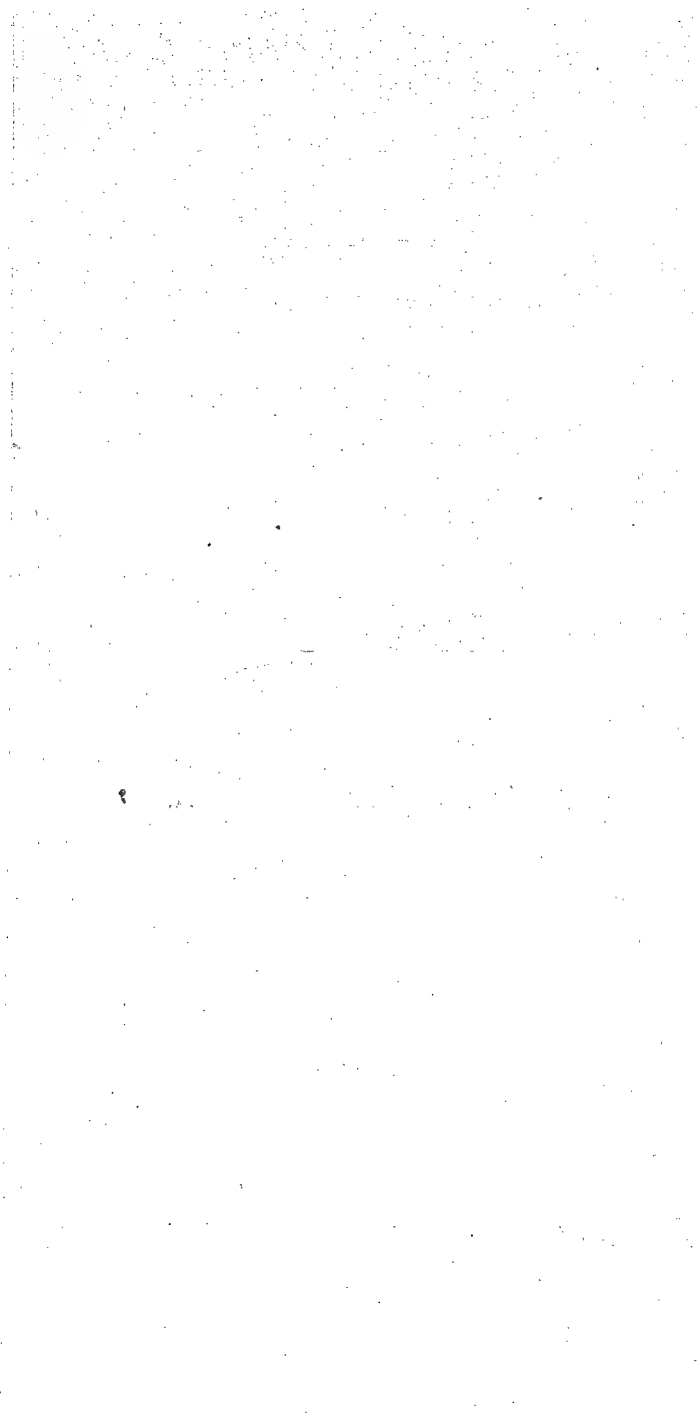
باہتمام کالی ۔ کے مترا پرنٹر، انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد ۔

جنرل سکریٹری ۔ مجلس استقبالیہ رام گڑھ کانگریس نے شائع کیا